

آغز تاسفر



بین الدینی جماعت کے پختل کے لئے

آغازِ سفر

- ۱۔ میں کہاں ہوں
- ۲۔ مہلاپ
- ۳۔ ڈاکٹر گڈا

دعوۃ الہیہ

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مطبوعات نمبر ۱۳۱.....

ادارت و نظارتی: محمد افتخار کھوکھر، محمد شاہد رفیع
پبلیشر: دعوت الہیہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
مطبع: مارشل پرنٹنگ پریس راولپنڈی
ٹائٹل ڈیزائن: سید مبین الرحمن
طبع اول: ستمبر ۱۹۹۰ء
مقدار اشاعت: پانچ ہزار

پیش لفظ

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول ہمیں بتائے ہیں ان میں ایک بڑا اہم اور بنیادی اصول یہ ہے کہ لوگوں تک ان کی استعداد اور سمجھ کے مطابق اپنی بات پہنچاؤ۔ اس سہرے اصول کے مطابق دعوتِ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد مختلف طبقہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد تک اسلام کی بنیادی تعلیمات پہنچانے کے لیے دعوتی و تبلیغی لٹریچر کی تیاری اور اشاعت میں مصروف ہے۔

”بچے جنت کے پھول ہیں“ یہ قول جتنا خوبصورت ہے، اسی قدر اس کے معنی و مفہوم کے بے پناہ رنگ و ذہن و قلب پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں پھول کسی بھی رنگ کا ہو، وہ پھول ہی کہلاتا ہے، اسی طرح بچہ جیسا بھی ہو ماں باپ کے لیے آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔

نمائے پیارے نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر بچہ نیک اور ستھری فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ دعوتِ اکیڈمی نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نئی نسل کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تربیت کے لیے شعبہ بچوں کا ادب قائم کیا۔ اس شعبہ کے تحت گزشتہ تین سال میں بچوں کے لیے لکھنے والے معروف ادیبوں کا دوروزہ سیمینار نئے لکھنے والوں کی تربیت و رہنمائی کے لیے تین روزہ ورکشاپ، بچوں کے ماہانہ رسائل کا جائزہ بچوں کے لیے دس کہانیوں کا دلچسپ سیٹ اردو زبان میں کہانیوں کے دو انعامی مقابلوں کے بعد اب علاقائی زبانوں سندھی اور پشتو میں کہانیوں کے انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا ہے۔

کہانیوں کا زیرِ نظر مجموعہ اس موقع اور خواہش کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے کہ ان کہانیوں کے مطالعہ سے کم سن قارئین کے سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی کا آغاز ہو سکے گا۔

بچوں کے لیے کہانیوں کی تیاری اور اشاعت کے سلسلہ میں ہم نے ذاتی انداز کو ترک کر کے ہر عمر کے بچوں کے لیے کہانیوں کا الگ الگ سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر یہ ہے کہ چار مختلف مدارج یعنی پہلی سے تیسری جماعت، چوتھی پانچویں جماعت، چھٹی سے آٹھویں جماعت اور نویں، دسویں جماعت کے بچوں کے لیے ان کی ذہنی سطح اور مزاج کے مطابق کہانیاں شائع کی جائیں۔

اس مقصد میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا فیصلہ جہاں ہمارے نو عمر قاری کریں گے۔ وہیں ہمیں بچوں کے والدین کی آراء کا بھی انتظار ہے گا کہ انہوں نے اس سلسلہ کو کس حد تک مفید پایا اور وہ اس میں مزید کیا کیا تبدیلیاں تجویز کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد احمد غازی

ڈائریکٹر جنرل

دعوتِ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

اک ذرا سی بات

کلاس میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ استاد صاحب طلبہ کے حل شدہ پرچوں کا بندل کھول رہے تھے۔ یہ انگریزی کے ہفتہ وار ٹسٹ کا رزلٹ تھا۔ جونہی استاد صاحب نے پہلے پرچے کو اٹھایا اور لڑکے کا نام پڑھا، کھسر پھسر بند ہو گئی..... لڑکوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں..... لیکن عاصم کا دل تو دھڑکنے کے بجائے اچھل کود کر رہا تھا۔ بڑی بے چینی سے اپنے نام کے پکارے جانے کا منتظر تھا۔

استاد صاحب نے اب تک جتنے لڑکوں کا نام پکارا تھا، ان میں سے پچاس میں پینتیس نمبروں والا رشید سب سے اول تھا۔ پھر آواز آئی..... ”عاصم خاں“ ”ہینتا لیس“..... کلاس کے تمام لڑکے عاصم کی طرف متوجہ ہوئے، جس کا چہرہ خوشی کے جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں کامیابی کی چمک کا تو پوچھنا ہی کیا۔ نمبر ابھی بھی بتائے جا رہے تھے، لیکن چالیس سے زیادہ تک کوئی نہیں گیا تھا۔ مگر عاصم کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا کیونکہ اس کا سب سے بڑا حریف، اظہر ابھی باقی تھا..... آخر اس کا نام بھی استاد صاحب نے پکارا..... اظہر کا نام لے کر استاد صاحب تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے، پھر بولے ”سینتا لیس“۔

عاصم کا چہرہ..... مختلف رنگوں کی نمائش کر رہا تھا..... کیونکہ اظہر اس دفعہ پھر اس سے بازی لے گیا تھا۔ رزلٹ کا اعلان ہو چکا تو استاد صاحب کلاس سے کچھ کہہ رہے تھے، مگر عاصم اپنے پرچے کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”پورے چھ ماہ سے میں اول آ رہا تھا۔ یہ اظہر پتہ نہیں کہاں سے آن پکا۔ دیہاتی کہیں کا! تیسری دفعہ مجھ سے زیادہ نمبر لے چکا ہے۔ اس کا علاج کرنا پڑے گا۔“ صرف دو نمبر وہ اس سے آگے نکل گیا، معلوم نہیں کیا موتی پرودے تھے، جو استاد صاحب نے دو نمبر اسے زیادہ دے دیئے۔ بس چلے تو کان سے پکڑ کر سکول سے باہر نکال دوں! آجاتا ہے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر۔“ جیسے جیسے وہ سوچتا جاتا اس پر جھلاہٹ اور سوار ہو جاتی۔ اور چھٹی تک اسی کی یہی کیفیت رہی۔ گھنٹی بجی تو چپکے سے اٹھا، باہر گیٹ پر گاڑی لینے آچکی تھی۔ بیٹھا اور کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔ ڈرائیور جان گیا کہ موڈ سخت

خراب ہے۔ لہذا چپکے سے گاڑی چلاتا رہا۔ عاصم راستے میں اظہر کو پچھاڑنے کے طریقے سوچتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا تو ایک عدد ترکیب سوچ چکا تھا۔

اپنی ترکیب پر عمل کرنے کے لئے اسے کافی دن انتظار کرنا پڑا۔ آخر بدھ کا دن آئی گیا۔ یعنی شٹ سے ایک دن پہلے کا دن! آج تفریح کے وقت عنایت کی ڈیوٹی تھی کہ وہ کلاس روم میں رہے اور کتابوں وغیرہ کی حفاظت کرے۔

تفریح کے وقت عاصم کمرے کے ارد گرد منڈلاتا رہا کہ عنایت کب ذرا کمرے سے باہر جائے اور کب وہ اپنی ترکیب پر عمل کرے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ جو نئی عنایت پانی پینے کے لئے گیا، عاصم کمرے کی پچھلی کھڑکی سے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اظہر کے بیگ سے اس کی انگریزی کی نوٹ بک اور کتاب اٹھائی اور کمرے سے باہر آگیا۔ اس کا رروائی کے دوران اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک انجانا سا خوف اس پر سوار ہو گیا تھا۔ بہر حال کتابیں بغل میں دبائے وہ اسی جگہ چھپانے جا رہا تھا جہاں سے کوئی انہیں ڈھونڈ نہ سکے۔

”اب دیکھوں گا، کیسے زیادہ نمبر لیتے ہو، ایک آدھے سوال تو چھوڑو گے ہی!“

دس بارہ نمبر زیادہ لے کر پچھلا تمام فرق برابر کر دوں گا۔“ وہ سوچے چلا جا رہا تھا۔

تفریح ختم ہوئی۔ اس کے بعد انگریزی کا کوئی پیرڈ نہیں تھا۔ لہذا اظہر کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ عاصم خوش تھا کہ اس کی ترکیب کامیاب جا رہی ہے۔

اظہر شام کو شٹ کی تیاری کرنے بیٹھا تو کتابوں کو گم پا کر سخت پریشان ہوا۔ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اسے تو ابھی کافی تیاری کرنی تھی اور محلے میں وہ نئے نئے آئے تھے۔ کسی سے کتاب مانگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی تیاری کا زیادہ انحصار تو ان نوٹس پر تھا جو کلاس میں لئے گئے تھے۔ پھر اس کی سوچوں کا سلسلہ اور پھیلا تو اس کے جی میں آیا۔ ”کتاب اور نوٹ بک کا اکٹھے گم ہونا، وہ بھی شٹ سے ایک دن پہلے۔ یہ محض اتفاق تو نہیں لگتا! تو پھر یہ کس کی شرارت ہے؟ کون اتنی جلدی میرا دشمن بن سکتا ہے؟“ کہیں عاصم کی تو شرارت نہیں؟..... نہیں، نہیں، مجھے ایسے ہی کسی پر شک نہیں کرنا چاہئے، کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر کسی پر شک کرنا گناہ ہے!..... یہاں تک پہنچ کر اس نے سوچنا بند کر دیا۔ شٹ کے بارے میں جو کچھ یاد تھا، اسے ذہن میں دہرانے لگا، اس کے علاوہ وہ کب بھی کیا سکتا تھا۔ ہاں البتہ اس کے علاوہ بھی اس نے ایک کام کیا۔ یعنی خدا سے دعا۔

صبح ہوئی، شٹ کا وقت آیا اور اس نے شٹ دیا اس کا ایک سوال رہ گیا تھا۔ استاد صاحب نے جب اس کے پرچے کو ایک نظر دیکھا تو حیرانی سے بولے۔

”اظہر، تم نے آخری سوال کا جواب کیوں نہیں لکھا؟“

”سر، وہ..... میری کتاب اور نوٹ بک کل کلاس میں گم ہو گئی تھی۔“

اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

”کیا؟..... کب گم ہوئی؟“

”سر! معلوم نہیں“ کل صبح تو تھیں، لیکن گھر جا کر دیکھا تو بیگ سے یہ دونوں غائب تھیں!“ کلاس میں

بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد استاد صاحب کی آواز گونجی!

”کل تفریح کے وقت کس کی ڈیوٹی تھی؟“

”مم..... میری سر!“ عنایت نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”تو تم نے چرائی ہیں اس کی کتابیں؟“

”نہیں سر..... میں نے نہیں..... بلکہ وہ..... جب.....“

”کیا وہ جب لگا رکھی ہے، بتاؤ کہاں گئے تھے ڈیوٹی کے دوران؟“

”کہیں نہیں سر..... صرف پانی پینے گیا تھا..... چچ، چار، پانچ منٹ میں آگیا تھا۔“

عنایت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

استاد صاحب نے زور سے ”ہوں“ کی اور ڈنڈا لہراتے ہوئے عنایت کی طرف بڑھے اور پھر اس کی اچھی

خاصی پٹائی کر دی۔ وہ ساتھ ساتھ بول رہے تھے۔

”پیا سامر رہا تھا، بعد میں پی لیتا پانی..... اور جب تک کتابیں نہیں مل جاتیں، تمہاری کتابیں اظہر کے

پاس رہیں گی۔“

عنایت بے چارہ روئے جا رہا تھا۔ عنایت کی یہ حالت دیکھ کر عاصم کو اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا.....

اس کی وجہ سے دو لڑکوں کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑ رہی تھی۔

ابھی وہ اسی خیال میں تھا کہ استاد صاحب کی آواز پھر گونجی۔

تمام لڑکے سن لیں! چوری کبھی چھپی نہیں رہ سکتی..... میں ہر صورت میں معلوم کر لوں گا کہ چور کون

ہے..... اس لئے جس نے بھی یہ شرارت کی ہے، وہ خود مجھے علیحدگی میں بتا دے، ورنہ اگر پکڑا گیا تو سکول سے باہر

نکال دیا جائے گا۔ اور پھر وہ کسی بھی سکول میں داخل نہیں ہو سکے گا۔“

کلاس میں موت کا سناٹا تھا۔ عاصم یوں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اسے ابھی گردن سے پکڑ کر نکال دیا

جائے گا۔ اور جب اس کی نظریں اظہر سے ٹکرائیں..... جو پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہا تھا..... تو اسے یوں لگا جیسے

اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا ہے۔ اظہر اس کی یہ حالت دیکھ کر معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ

اب جھٹٹی کا انتظار کر رہا تھا۔

جونہی گھنٹی بجی عاصم باہر کی طرف لپکا۔ مگر ابھی وہ کلاس روم سے تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ کسی نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اظہر تھا۔ عاصم کو یوں لگا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہو۔

”کک..... کیا بات ہے، وہ اظہر کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ہکلا یا۔“

”کہاں چھپائی ہیں میری کتابیں؟“ اظہر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”مم..... مجھے کیا معلوم؟..... میں کوئی چور ہوں، تمہاری کتابوں کا!“
 ”تو پھر اتنے پریشان کیوں ہو؟ ہکلا کیوں رہے ہو؟“

..... مجھے کتابیں واپس کر دو، میں کہہ دوں گا کہ میں اس دن کتابیں گھر بھول آیا تھا۔
 ”مگر تم تو کہہ چکے ہو کہ صبح تمہارے پاس کتابیں تھیں!“ عاصم کے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا۔
 ”لیکن اب میں تمہیں سکول سے باہر نکلتا تو نہیں دیکھ سکتا!“ اظہر کی آواز میں بے پناہ ہمدردی تھی۔
 عاصم کے چہرے پر پسینے کے قطرے بہہ نکلے۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے پاؤں سے زمین کرید رہا تھا۔
 اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ اظہر اسے اس کی حالت میں دیکھ کر بولا۔
 ”کوئی بات نہیں، تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا!“
 اظہر، عاصم کو وہاں چھوڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔

اگلے دن ٹسٹ کے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو عاصم کی کلاس میں اول آنے کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ اس کے نمبر سینتالیس ہی آئے تھے، مگر اس کا حریف یعنی اظہر صرف تیس نمبر لے سکا۔ عاصم کو اپنی فتح کی کوئی خوشی نہ ہوئی۔

نتیجہ کا اعلان ہو چکا تو اظہر نے کھڑے ہو کر کہا..... ”سر! مجھے کتابیں مل گئیں ہیں.....“
 ”کیا؟..... اچھا! تو یہ سارا چکر خود ہی چلایا تھا! کہ اگر فیل ہو گیا تو سزا نہ ملے۔ واہ بیٹا واہ!!“
 پھر وہ اظہر کو مختلف خطابات سے نوازتے ڈنڈالے کر اس کی طرف بڑھے اور اظہر کی پٹائی شروع کر دی..... اور اس کی پٹائی عنایت سے بھی کہیں زیادہ ہوئی..... اظہر نے ساری زندگی اتنی مار نہیں کھائی تھی..... لیکن وہ صبر سے مار کھاتا رہا..... نہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو آیا، اور نہ اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلا.....
 پیرڈ ختم..... پھر تفریح کا پیرڈ شروع ہوا..... اظہر کلاس روم میں ہی بیٹھا رہا۔ آج کلاس میں ڈیوٹی بھی اس کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عاصم کلاس روم میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں اظہر کی کتابیں تھیں، وہ اس کے پاس گیا..... اور کہنے لگا.....

”تم اس مرتبہ پھر بازی لے گئے..... میں تم سے کبھی آگے نہ بڑھ سکوں گا، انسان نمبروں سے بڑا نہیں ہوتا..... ایثار اور خلوص سے بڑا ہوتا ہے، اس لئے تم مجھ سے بڑے ہو“ ان الفاظ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی بہے جا رہے تھے۔ اظہر نے اسے گلے لگالیا۔

آغزِ سفر

سلیم اور رحیم دونوں بھائی تھے ان کا باپ کریم ایک معمار تھا۔ جب رحیم آٹھ برس کا اور سلیم دس برس کا تھا تو اس کا باپ کریم ایک فلیٹ کی تعمیر کے دوران اوپر کی منزل سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد کم عمر سلیم پہ گھر کا بوجھ آن پڑا۔ ماں بیچاری آدمی نابینا تھی ایک آنکھ سے تو بالکل ہی دکھائی نہ دیتا تھا۔ کیونکہ اس کی ایک آنکھ میں کالا موتیا تر آیا تھا اور غریبوں کیلئے تو ایسے بڑے بڑے مرض زندگی بھر کے لئے ایک ناسور بن جاتے ہیں، اسی بیماری کی وجہ سے اس کی دوسری آنکھ بھی کچھ متاثر ہو گئی۔

سلیم اور رحیم دونوں ایک سرکاری سکول میں پڑھتے تھے رحیم تو ابھی دوسری جماعت میں تھا اور سلیم پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا..... کریم بیچارہ اپنی زندگی میں یہی ایک خواب دیکھا کرتا اور یہی ایک خواہش ہر ایک سے بیان کرتا کہ ”میں مزدور ضرور ہوں مگر اپنے بیٹوں کو پڑھا لکھا کر صاحب بناؤں گا صاحب“ مگر اس کے مرتے ہی جیسے اس کی تمام خواہشیں بھی دم توڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ رشتہ داروں نے کریم کے مرنے کے بعد سلیم کو ایک پرچون کی دکان پر نوکر رکھوا دیا..... وہ دکان کے مالک کا ہاتھ بٹاتا..... اس طرح اس کے ننھے ننھے ہاتھ مہینے بھر کی مشقت کے بعد جب کمائی ہوئی معمولی سی رقم لا کر ماں کو دیتے تو وہ اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر سسک پڑتی۔ اتنی کم عمری میں گھر کا بوجھ اس پر آن پڑا تھا۔ زندگی کے اس نئے رخ نے اس کے ناپختہ ذہن کو وقت سے بہت پہلے ہی سمجھ دار اور حساس بنا دیا تھا.....

وقت کے ساتھ ساتھ رحیم اور سلیم بڑے ہوتے گئے، سلیم کو اس دکان پہ کام کرتے ہوئے کئی سال گزر گئے، دکاندار بھی اس کی ایمانداری اور شرافت پہ بھروسہ کرنے لگا تھا۔ اسی لئے وہ کبھی کبھار دکان کی ساری ذمہ داری اس کے سپرد کر کے کام سے ادھر ادھر چلا جاتا تھا..... اس دکاندار کا ایک لڑکا وحید تھا جو سکول جانے کی بجائے آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا اور فلم و تھیٹر میں جا کر وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ باپ کو شاید اس کے غلط کرتوتوں کا علم نہیں تھا..... وہ کبھی کبھار سلیم کو بھی فلمیں دیکھنے اور آوارہ گردی کرنے کی دعوت دیتا مگر سلیم

اس کی اور اس کے دوستوں کی صحبت سے کتراتا تھا اس لئے ہمیشہ انکار کرتا۔ وہ دکان بند ہوتے ہی سیدھا اپنے گھر چلا جاتا۔..... آج بھی دکاندار جب دکان کیلئے کچھ مال خریدنے بازار جا رہا تھا تو دکان وحید اور سلیم کے حوالے کر گیا۔..... جب دکان پر سے گاہکوں کی بھیڑ کچھ کم ہوئی تو وحید نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر سلیم کو دیتے ہوئے کہا کہ ”ذرا تم بھاگ کر سامنے والے نکر سے ایک روپے کے گرم گرم پکوڑے تولے آؤ بڑی زور کی بھوک لگی ہے باقی جو دو چار گاہک ہیں ان کو میں نمٹالوں گا“ بیچارہ سیدھا سادھا سلیم اس کی باتوں میں آکر پکوڑے لانے چلا گیا اور وحید نے جلدی جلدی گاہکوں کو نمٹانا شروع کر دیا۔ جب سب گاہک چلے گئے تو وہ روپے کی تجوری کی جانب بڑھا اور اس میں سے پانچ دس کے کئی نوٹ نکالے اور اسے مروڑ کر اپنی شلوار کے نیپے میں اڑس لیا۔.....

دکاندار جب شام کو دکان بند کرنے سے پہلے دن بھر کی فروخت کا حساب لگانے بیٹھا تو اسے آج پھر یہ شک ہوا کہ جیسے آج کاروبار پھر کچھ مندار ہا۔ اسے روزانہ کی دن بھر کی فروخت کا خاصا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ روزانہ دکان بند کرنے سے پہلے دن بھر کی کمائی ہوئی رقم گنتا اور ہفتہ پندرہ دنوں میں سے ایک دن ضرور ایسا ہوتا کہ جب وہ دکان سلیم اور وحید کے حوالے کر کے جاتا تو دن بھر کی دکانداری کے بعد بہت معمولی سی رقم تجوری سے نکلتی۔..... دکاندار کو سلیم پر شک ہونے لگا تھا۔ آج تو اس نے سلیم کو دکان بند کرنے سے کچھ دیر پہلے ہی چھٹی دیدی تھی اس لئے اسے سلیم سے کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملا البتہ اس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے بیٹے وحید کو آواز دی ”وحید کیا تو میری غیر موجودگی میں دکان پہ سلیم کو اکیلا چھوڑ کر گیا تھا۔“

نہیں تو ابا“ وہ جھجک کر بولا۔

میں جب بھی دکان تم دونوں کے حوالے کر کے جاتا ہوں تو تجوری میں سے پیسے کیوں کم ہو جاتے ہیں‘ سچ بتاؤ ضرور دکان سلیم کے حوالے کر کے ادھر ادھر نکل جاتا ہو گا“ دکاندار سختی سے بولا۔..... وحید خاموش کھڑا کوئی معقول سا جواب سوچنے لگا۔

”بتا خاموش کیوں ہے“

”ابا..... مجھے کوئی کام ہوتا ہے تو میں چلا جاتا ہوں“ اس نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

”تیرے کام کی ایسی کی تیری“ مردود کہیں کا آج کہاں گیا تھا تو“ وہ غصے سے دھاڑا۔

”آج..... وہ آج سلیم نے مجھے پکوڑے لانے کیلئے بھیجا تھا“ اس نے اپنا جرم سلیم پر تھوپ دیا۔

”تو گیا کیوں تھا“ کیا تجھے اپنی دکان سے زیادہ اس کے پکوڑے عزیز تھے“

”ابا میں نہیں جا رہا تھا اس نے زبردستی مجھے بھیجا کہ بہت بھوک لگی ہے لے آؤ“ تو میں چلا گیا“ وحید نے

بڑی چالاکی سے اپنے جرم میں بے قصور سلیم کو پھنسا دیا۔

”ہوں..... تیری خبر تو میں گھر چل کر لوں گا اور سلیم کے بچے کو بھی اچھی طرح سمجھ لوں گا“ تو اس کے

کہنے میں آکر کسی دن پوری دکان کو ہی لٹوا دیگا“ دکاندار نے دکان بند کی اور غصے میں بڑبڑاتا ہوا گھر چلا گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے سلیم دکان پر پہنچا تو دکاندار غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ ”اسلام و علیکم“ سلیم نے دکان میں داخل ہوتے ہوئے روزانہ کی طرح خوش اخلاقی سے اسے سلام کیا۔

”وعلیکم اسلام میاں“ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں اپنا حساب کتاب کر کے تنخواہ لے لو اور چھٹی کرو، وہ سلام کا جواب بڑی رکھائی سے دیکر ترش لہجے میں کہا۔

”کیوں جناب خیر تو ہے“ سلیم دکاندار کے چڑھے ہوئے تیور دیکھ کر ہکا بکارہ گیا۔

”نہیں میاں اپنے گھر کا راستہ ناپو“ اب تمہیں ایک دن کیلئے بھی دکان پہ برداشت نہیں کر سکتا“

وہ بدستور پیشانی پہ بل ڈال کر بڑی رکھائی سے بولا.....

”جناب کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کچھ تو بتائیں کہ آخر بات کیا ہے“ سلیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا

تھا۔

”بہت اعتماد کر لیا میں نے تم پر، تمہیں یتیم جان کر ترس کھاتے ہوئے اپنی دکان میں نوکر رکھ لیا۔ مگر مجھے میری نیکی کا یہی صلہ ملا کہ میری دکان کو تم مسلسل نقصان پہنچا رہے ہو، میں نے تم پر اپنے بیٹے کی طرح بھروسہ کیا اور تم چور نکلے..... پچھلے کئی مہینوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم ہفتہ پندرہ دن بعد میری غیر موجودگی میں تجوری سے اچھی خاصی رقم چرا لیتے ہو“ دکاندار اس پر برس پڑا اور بغیر ثبوت کے اس پہ الزام لگادیا.....

”جناب یہ سراسر الزام ہے، بہتان ہے مجھ پر، خدا گواہ ہے کہ میں تجوری کی طرف غلط نظر ڈالنا گناہ تصور کرتا ہوں، اگر آپ کو اب میری ضرورت نہیں رہی تو یوں جھوٹی تہمت لگا کر کیوں نکال رہے ہیں“ سلیم نے احتجاج کیا ”جاؤ میاں جاؤ زیادہ باتیں نہ بناؤ کسی اور کو جا کر سمجھانا، لو اپنی تنخواہ کی یہ رقم اور چھٹی کرو“ دکاندار نے جھنجھلا کر تیز لہجے میں کہا اور روپے سلیم کو تھما کر اپنے کام میں لگ گیا..... دکاندار سلیم سے اس کی صفائی میں ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ ہوا تو وہ بیچارہ آزدہ سا گھر لوٹ آیا اس کا غیرت مند ضمیر یہ جھوٹا الزام برداشت نہ کر سکا وہ گھر آکر خوب رویا اور نتیجتاً وہ بیمار پڑ گیا..... جبکہ اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا تو وہ اپنی ٹوٹی چارپائی پہ پڑا برابر یہی سوچے جارہا تھا کہ اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ میں اب کہاں نوکری ڈھونڈنے جاؤں، لوگ تو ایک بے سہارا، غریب اور یتیم لڑکے کو جلدی نوکری بھی نہیں دیتے، رحیم کا امتحان بھی ہونے والا ہے، اس کی فیس دینے کیلئے کہاں سے پیسے لاؤں اگر اس کی فیس نہ دی تو پھر وہ امتحان نہیں دے سکے گا اور اس کا سال برباد ہو جائے گا“ وہ اتنی دیر سے یہی سوچے جارہا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بھائی بھی اس کی طرح جاہل رہ کر زندگی بسر کرے، وہ خود تو نہ پڑھ سکتا تھا مگر اپنے بھائی کو پڑھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا، سلیم ان پریشان کن خیالات سے گھبرا کر رو پڑا اس کی سسکیوں کی آواز سن کر ماں اس کے قریب آگئی ”کیا بات ہے بیٹے، طبیعت زیادہ خراب لگتی ہے“ ماں نے پیار سے اس پہ جھک کر پوچھا۔

”نہیں ماں“ وہ اداسی سے بولا۔

”پھر تو ضرور نوکری چھوٹ جانے کا سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا ہے۔“

”ہاں ماں“

ارے دکا ندار نے تجھے نوکری سے نکال دیا تو کیا ہوا، پریشان کیوں ہوتا ہے تو، روزی دینے والا تو اللہ ہے ”ماں نے اسے سمجھایا

”نوکری چھوٹنے کا مجھے اتنا غم نہیں ماں، اس نے مجھ پہ جھوٹا لزام بھی تو لگایا ہے“ وہ پھر رو دیا۔
”بیٹا اگر تو بے قصور ہے تو اللہ ہی انصاف کرنے والا ہے تو کیوں اپنی جان کو ہلکان کرتا ہے، شام کو تجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی، جان رہی تو ہزاروں نوکریاں مل جائیں گی“
مگر ماں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے پیسے بھی تو ہونے چاہئیں۔
”تو فکر نہ کر دوا کیلئے میرے پاس کچھ پیسے ہیں“
”ماں مجھے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے تو مکان کا کرایہ دیکر گھر کے خرچ کیلئے بھی رقم پوری نہ پڑتی تھی آپ نے کیسے بچائے پیسے“

”پڑوس والی خالہ ایک کمپنی سے شیشوں والی ٹوپیاں بنانے کیلئے لاتی ہے میں نے بھی تھوڑی سی ٹوپیاں ان سے لیکر بنائی تھیں، انہیں ٹوپوں کے پیسے رکھے ہوئے ہیں“
مگر ماں آپ کی آنکھیں پہلے ہی کمزور ہیں آپ نے کیوں بنائی ٹوپیاں۔ اگر تکلیف خدا نخواستہ اور بڑھ گئی تو“

”ارے کچھ نہیں ہوتا بیٹے، تم دونوں کی جان رہی تو میں اندھی ہو کر بھی ساری دنیا دیکھ سکتی ہوں“
”مگر ماں اب نہ کرنا یہ کام“

”اچھا اب نہیں کروں گی بس تو بے فکر ہو جا اپنے آپ کو ہلکان نہ کر اور سوچ سوچ کر پریشان نہ ہو“
”ماں آپ نے جو پیسے دوا کیلئے رکھے ہیں نا وہ رحیم کی فیس کیلئے دیدیں اس کی فیس کی تاریخ بھی تو نکلی جا رہی ہے اگر اس نے دو دن کے اندر فیس جمع نہ کرائی تو وہ امتحان میں نہ بیٹھ سکے گا۔“

”پر تیری دوا کا کیا ہو گا، تجھے اتنا تیز بخار ہے۔ ہفتہ ہو گیا اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ڈاکٹر کو دکھانا بھی تو ضروری ہے۔ اب تو جو شانہ بھی نقلی آنے لگا ہے، نہیں تو دو آنے کی جو شانہ کی پڑیا نزلہ، زکام، بخار سب دور کر دیتی تھی“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”فکر نہ کریں ماں خیراتی ہسپتال ہم غریبوں کیلئے ہی تو ہے وہاں سے دوا لے آؤں گا آپ وہ پیسے رحیم کی فیس کیلئے دیدیں اس کا سال ضائع ہو گیا تو سمجھیں کہ ہمارے دکھوں کا ایک سال اور بڑھ جائے گا“ رحیم نے ماں کو سمجھایا اور پھر سلیم کیلئے خیراتی ہسپتال سے دوا لے آئی اور چند دنوں میں وہ اچھا ہو گیا، رحیم نے امتحانی فیس جمع کرا کے مڈل کا امتحان دیا اور امتحان پاس ہو گیا۔

سلیم نے صحت یاب ہونے کے بعد بہت کام ڈھونڈا مگر کہیں اسے کام نہ ملا آخر محلے کا ایک آدمی اس پر ترس کھا کر اسے ایک ٹھیکیدار کے پاس لے گیا۔ ٹھیکیدار کے پاس عمارتوں اور فلیٹوں کی تعمیر کا ٹھیکہ تھا اس

نے سلیم کو رکھ لیا اور سلیم بھی بڑی محنت سے کاریگروں کے ساتھ مل کر مزدوری کا کام کرنے لگا اس کے ذمے بحری، ریت اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام تھا.....

کچھ دنوں بعد ٹھیکیدار نے اس سے کہا کہ ”میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں تم اپنی عمر سے زیادہ محنت کرتے ہو، مجھے تمہاری ہی طرح ایک اور لڑکے کی ضرورت ہے اگر تمہاری نظر میں کوئی محنتی لڑکا ہو تو اسے لیکر میرے پاس آؤ“.....

گھر آکر اس نے اپنی ماں سے کہا کہ ”آج سیٹھ نے میرے کام کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ اپنی طرح کا کوئی اور لڑکا ڈھونڈ کر لاؤ“

”بھیا مجھے بھی دلادو وہاں کام“ رحیم جو قریب ہی بیٹھا تھا اس کی بات سن کر جلدی سے بولا
 ”تم مزدوری کرو گے اور پڑھے گا کون؟ سلیم اس کی طرف دیکھ کر خفگی سے بولا۔
 ”سکول کے بعد مزدوری کر لیا کروں گا“ اس میں پریشانی کی کیابات ہے ”رحیم بڑے حوصلے سے بولا۔
 ”نہیں تمہاری پڑھائی کا بھی خرچ ہو گا اور تمہارے سکول کے لڑکے تمہارا مذاق اڑائیں گے“ میں تم سے مزدوری نہیں کر اؤں گا، میں تو تمہیں ایک بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔

”بھیا کیا مزدوری کرنے والے اور بوجھ ڈھونے والے لوگ انسان نہیں ہوتے، مجھے کسی کے مذاق اڑانے کی پرواہ نہیں، مذاق اڑانے والے تو بہت ہیں مگر کسی کی ضرورتیں کوئی پوری نہیں کرتا۔ اپنا پیٹ بھرنے کیلئے تو خود ہی محنت کرنی پڑتی ہے نا، پھر ہم کیوں شرم کریں محنت میں تو عظمت ہے اور محنت کرنے والوں ہی کو عزت ملتی ہے“ رحیم نے بھائی کو دلائل دیکر سمجھایا اور پھر وہ ضد کر کے دوسرے ہی دن سلیم کے ساتھ سیٹھ کے پاس گیا اس نے رحیم کو رکھ لیا..... اب دونوں بھائی خوب محنت اور تندہی سے کام کرنے لگے، سکول سے واپس آکر رحیم کام پہ چلا جاتا اور وہاں سے واپس آکر رات گئے لائین کی روشنی میں بیٹھا پڑھتا رہتا.....

اسی طرح ماہ و سال گزرتے رہے رحیم اب میٹرک میں پہنچ گیا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ ملکر مزدوری بھی کرتا اور پڑھتا بھی رہا۔ انہیں دن بھر کی اچھی خاصی اجرت ملی جاتی تھی..... ماں بھی سمجھدار تھی وہ گھر کے خرچ سے کافی رقم بچا کر جمع کرتی رہتی..... رحیم نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ سلیم نے اب اس سے مزدوری کروانا چھڑوا دیا تھا۔ اب وہ کالج جانے لگا تھا۔ کالج سے واپس آکر وہ محلے کے کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا جس سے اس کی پڑھائی کا خرچ نکل آتا..... کالج کے یہ دو سال بھی پر لگا کر اڑ گئے اور اس نے انٹر (سائنس) فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا..... پھر ایک دن ایک معمار باپ کا معمار بیٹا ”ڈاکٹر“ بن چکا تھا..... سلیم بھی آج بہت خوش تھا، اس نے اپنے مرحوم باپ کے خواب کو سچ کر دکھایا تھا۔ اس نے رحیم کو باپ بن کر پڑھایا لکھایا اور ایک بڑا آدمی اور باعزت شخص بنانے میں کامیاب ہو گیا..... اسے اس بات کا کوئی دکھ نہیں تھا کہ وہ بھائی کو پڑھانے کی دھن میں خود جا مل رہا گیا..... اس کی پڑھائی کا دور تو اب شروع ہونے والا تھا..... علم کے حصول کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی، اسے عمر کے ہر دور میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے تو

دل میں عہد کیا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی رحیم کو اس کی منزل تک پہنچانے کے بعد اپنی منزل کا تعین کرے گا.....
اس نے ایسا ہی کیا۔

میں کہاں ہوں؟

”کیوں محمود..... اس دفعہ عید پر کون سے جوتے خریدو گے.....“
سکول کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے وسیم نے پوچھا
”وہی شالیمار والے.....“ محمود نے مختصر جواب دیا
”اوہو..... وہ تو بالکل بیکار ہیں..... ایک دم تھرڈ کلاس..... میں تو اس دفعہ امریکہ والے جوتے خریدوں
گا.....“

”مگر ابھی تین مہینے پہلے ہی تو تم نے لندن سے جوتے منگوائے تھے.....“
”تو کیا ہوا..... عید پر تو نئے جوتے پہننے ہیں.....“
”تو شالیمار کے کیوں نہیں خریدتے.....“
”ارے یہاں کی ہر چیز بالکل بیکار اور تھرڈ کلاس ہوتی ہے..... کوئی فائدہ ہے خریدنے کا؟.....“
وسیم ہر امنہ بناتا ہوا بولا
”نہیں وسیم..... اپنے پاکستان کے جوتے تو دنیا بھر میں برآمد کئے جاتے ہیں اور وہ نہیں ہے انگلش بوٹ
کمپنی۔ اس کے کتنے اچھے جوتے ہوتے ہیں.....“
”ارے تو انگلش بوٹ کمپنی ہے نا اس لئے کوئی پاکستان بوٹ کمپنی تھوڑی ہے.....“ پھر وسیم دوبارہ
بولا..... ”محمود تم کیوں نہیں باہر کے جوتے منگواتے تمہارے بھائی بھی تو لندن میں ہیں.....“
”مجھے اپنے پاکستان کے جوتے بہت پسند ہیں.....“
”جاؤ یار تمہارا تو ذوق ہی اچھا نہیں..... لو میری گاڑی آگئی میں تو چلا اور وسیم محمود کو خدا حافظ کہہ کر چلا
گیا۔“

وسیم اور محمود دونوں دوست تھے کوئی عام دوست نہیں بہت گہرے اور پرانے دوست..... مگر اتنی گہری دوستی ہونے کے باوجود دونوں میں ایک بہت بڑا فرق تھا۔ محمود کو اپنے پیارے وطن پاکستان کی ایک ایک چیز اچھی لگتی تھی جب کہ وسیم کو تو پاکستان کاٹا تھا۔

”ایک تو یہاں کا ٹریفک اتنا گندا ہے..... کوئی ادھر سے تیزی سے نکلتا ہوا چلا جاتا ہے اور کوئی دوسری طرف سے اوور ٹیک کرتا ہوا نکل جاتا ہے.....“

ایک دن جب دونوں ایک گاڑی میں اکٹھے جا رہے تھے تو حسب عادت وسیم تبصرہ فرما رہا تھا۔
 ”اور یہ ویگن والے..... توبہ توبہ..... اتنی خراب طریقے سے چلاتے ہیں کہ بس..... یہاں کے لوگ ہی ایسے ہیں کچھ خیال ہی نہیں..... ارے باہر دیکھو فارن کے لوگوں کو دیکھو..... کتنا خیال رکھتے ہیں کتنے اچھے اور منظم طور پر رہتے ہیں.....“

”نہیں یار..... اپنے لوگ بھی بہت اچھے ہیں..... مگر مشکل یہ ہے کہ ان سے دوستی کئے بغیر ہی ہم دور سے اندازہ لگا کر رائے قائم کر لیتے ہیں تم ان لوگوں سے گھل مل کر تو دیکھو..... ان سے دوستی تو کرو..... پھر دیکھو تم کہو گے کہ ہمارے لوگ ہی سب سے بہترین ہیں.....“

”ارے چھوڑو یار محمود..... افوہ..... دیر ہو رہی ہے“ اور پھر خود وسیم گاڑی کی رفتار بڑھا کر اوور ٹیک کرنا شروع کر دیتا ہے۔

ایسی چھوٹی چھوٹی بحث دونوں کے درمیان ہر وقت ہوتی تھی دونوں اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے مگر ہمیشہ گفتگو کا انجام ”ارے چھوڑو یار“ پر ہوتا۔

یونہی دن گزرتے رہے اور پھر تعلیم ختم ہونے کے بعد دونوں اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے..... شادی بھی ہو گئی تھی اور شادی ہونے کے بعد بھی دونوں اسی بحث میں الجھتے تھے۔

”یار میں بالآخر لندن جا رہا ہوں..... رہنے کے لئے اپنی فیملی کے ساتھ“
 ”نہیں یار وسیم..... سچ سچ بتاؤ.....“

”بالکل سچ بتا رہا ہوں..... تنگ آ گیا تھا یار اس ملک میں رہتے ہوئے اب جا رہا ہوں.....“
 ”مگر یار..... اپنے ملک میں کیا خامی ہے..... کیوں چھوڑ کر جا رہا ہے.....“

”چھوڑو یار.....“

اور وسیم اپنے خاندان سمیت لندن چلا گیا..... لندن جو کہ اس کا آئیڈیل شہر تھا اور محمود..... وہیں رہا اپنے وطن میں..... چلتے چلتے محمود نے کہا تھا وسیم..... ایک دن تم واپس اپنے وطن آؤ گے اس کی مٹی کی تلاش میں دیکھ لینا.....“

”چھوڑو یار.....“ اور بات یہیں ختم ہو گئی تھی۔

لندن میں وسیم کو رہتے ہوئے اب ایک سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اس کا کاروبار بھی

جم گیا تھا۔ بچوں کو نہایت عمدہ سکول میں داخلہ دلوادیا تھا غرض یہ کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہی ہو رہا تھا اب وہ اس بے کار قوم کو اور بے کار زمین کے ٹکڑے کو چھوڑ کر اپنی آئیڈیل جگہ پر رہ رہا تھا۔ جہاں کے لوگ بہت منظم اور ہر وقت محبت کرنے والے تھے ٹرینک بھی بہت اچھا تھا۔ ہنگامے تو اب تک وسیم نے سنے بھی نہ تھے کہ ادھر کہیں ہوئے ہوں۔

پھر ایک دفعہ اس کی بیوی بیمار پڑ گئی سونے پر سہاگہ کہ وہ بھی بیمار ہو گیا ایک ہی بیٹا تھا اور ایک ہی بیٹی..... شام تک سکول سے واپسی ہوتی تھی ان کے گھر میں کوئی اور بھی نہ تھا اس کی بیوی کو بیماری میں ہی کام کرنا پڑتا تھا۔ ”ارے کیسے لوگ ہوتے ہیں یہاں کے..... ہمسایوں کی خیریت بھی معلوم نہیں کرتے اور یہ شاید پہلا موقع تھا جب وسیم نے بحث نہیں کی تھی اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کے لوگ جو کہ بہت ہی منظم طریقے پر زندگی گزارتے ہیں اس قوم کا ایک ایک فرد کام کرتا تھا..... اور ہر وقت کام کرتا تھا ان کے پاس کسی دوسرے کو دیکھنے کا وقت ہی نہ تھا..... اب وسیم کو محمود بہت یاد آیا کرتا تھا۔ ”ابو..... ہم لوگ کہاں کے ہیں؟..... ایک دن اس کے بیٹے نے سوال کیا

”کیا مطلب؟.....“ وہ حیران تھا۔

”سکول میں سب ہمیں پاکی پاکی کہتے ہیں..... یہ پاکی کیا ہوتا ہے.....“

”اور وسیم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کو کیا اس کے بچوں کو بھی یہاں والوں نے قبول نہیں کیا تھا۔

”بیٹے ہم چونکہ پاکستانی ہیں نا اس لئے پاکی پاکی کہتے ہیں“

”ڈیڈ..... یہ پاکستان کہاں ہے؟.....“ اس کے بیٹے نے سوال کیا اور وسیم اپنے ماضی میں کھو گیا ”ڈیڈ

کبھی پاکستان چلیں نا.....“

”ہوں.....“ اور وہ واپس اسی دنیا میں آ گیا..... ”چلو جاؤ..... بیکار کی باتیں مت کرو جاؤ جا کر ٹی وی دیکھ

لو.....“

اور اس کا بیٹا ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا، گانوں کا پروگرام آرہا تھا۔



”ڈیڈ..... میں آگے نہیں پڑھوں گا.....“

”کیا؟.....“ اس کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔

”مگر تم نے تو ابھی صرف سکول پاس کیا ہے..... ابھی تو تمہیں اور آگے بڑھنا ہے.....“

”نہیں ڈیڈ..... میں اب پڑھائی نہیں کروں گا..... میں تو راک اشار بننا چاہتا ہوں.....“

”کیا؟.....“ وسیم کی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

”راک اشار کیا؟.....“

”وہ گانے والا خوب تیز تیز گنار بجا کر.....“

”تو تم وہ بنو گے؟.....“

”یس ڈیڈ!.....“

”دفع ہو جاؤ اپنی صورت لے کر.....“

”وہ چیخا

”ہنہ..... پرانے زمانے کے آدمی.....“ اس کا بیٹا بڑا تاجدار ہاتھا۔

☆ ☆ ☆

پھر وہ ایک روز جب دفتر سے گھر پہنچا تو عجیب تیز کانوں میں چیختی ہوئی بے ہنگم آواز آرہی تھی..... وہ اپنے بیٹے کے کمرے کی طرف بڑھا، وہیں سے آواز آرہی تھی.....

”کیا ہو رہا ہے.....“

”گنار بجا رہا ہوں ڈیڈ.....“

”ارے..... یہ تمہارے بالوں اور حلقے کو کیا ہوا؟.....“

اور اس نے اپنا سر نوچ لیا پھر دروازے سے اس کی لڑکی داخل ہوئی..... اس کا حلیہ بھی اپنے بھائی جیسا تھا اور ہاتھ میں سگریٹ بھی دبی ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہے؟.....“ اس کو اپنی آنکھوں پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔

”میں بھائی کے ساتھ گانا گاتی ہوں نا.....“

اور اس دن اس پر پہلا دل کا دورہ پڑا تھا۔ پوری بیماری کے دوران اس کو محمود یاد آتا رہا تھا۔ صرف اس کی بیوی ہی ملنے آیا کرتی تھی ہسپتال میں..... ایک دن تو وہ بھی نہیں آئی پھر وہ ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا اس کے گھر والوں کا کچھ پتہ نہ تھا جب وہ گھر پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی منظر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا گھر جلا ہوا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کیا ہوا..... کیا ہوا..... اس نے پڑوس کے ایک گھر والوں سے پوچھا

”اس گھر میں کچھ کالے رہتے تھے چند دن پہلے گورے لوگوں نے حملہ کر دیا تھا“

”پھر پھر اس گھر میں رہنے والے کہاں گئے.....“

”وہ تو جل گئے تھے.....“

”نہیں.....“ اور اس کے دل کی دنیا دوبارہ اندھیر ہو گئی

☆ ☆ ☆

ایک طویل وقفے بعد اس کو ہوش آ رہا تھا..... شاید کوئی اس کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا..... اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں.....

”کیا ہوا دم..... تم کچھ کہہ رہے تھے.....“

اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا وہ تو اپنے گھر میں تھا اپنے پاکستانی گھر میں.....
اس کی بیوی اس کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

”میں..... میں کہاں ہوں..... اور تم تم.....“

مگر اسے ہوش آچکا تھا..... تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا یا قدرت نے اس کو ایک مہلت دی تھی..... یہ وہ
کبھی نہ جان سکا۔



”محمود..... میرے دوست..... میں لندن نہیں جا رہا..... میں کبھی ملک سے باہر نہیں جاؤں گا.....“

وہ حیران تھا مگر ساتھ ہی خوش بھی تھا..... معجزوں پر اس کا ایمان تھا۔

سامنے میز پر اخبار پڑا ہوا تھا..... ایک چھوٹی سی خبر تھی۔

”برطانیہ میں ایک پاکستانی خاندان کے پانچ افراد کو سفید فام نوجوانوں نے جلا کر ہلاک کر دیا“

وہ کوئی دوسرا خاندان تھا مگر وسیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا خواب حقیقت بن کر اس کے سامنے

آ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے پھر وہ اپنے وطن کی مٹی پر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

.....

ملاپ

شریفو آج معمول کے مطابق شہر میں گشت کر رہا تھا تاکہ وہ دیکھ سکے کہ اس کے پھیلائے ہوئے لڑکے صحیح دھندے پر لگے ہوئے ہیں یا نہیں۔ وہ ہفتہ میں ایک دو بار ضرور چیکنگ کرتا تھا اور جس کو دھندے سے جی چراتا دیکھتا اس کی شامت ہی آجاتی حسب معمول شریفو نے چیکنگ مکمل کی اور ایک معمولی سے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ چائے پینے کے بعد وہ باہر نکلا اور مخصوص سیٹی بجائی۔ لڑکے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے اور دس بارہ لڑکے ایک پرانی فقیروں کی بستی میں پہنچ گئے۔ یہ وہ بستی تھی جہاں پر فقیر اور بھیک مانگنے والے رہتے تھے۔

شریفو نے تمام لڑکوں سے پیسے جمع کرنے شروع کر دیئے۔ اس کی نظر احمد پر رک گئی۔ کیوں بے آج پھر تیرا دھندا مندا ہوا ہے۔ احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابا بولتا کیوں نہیں۔ کیا منہ میں زبان نہیں ہے اور ایک زوردار تھپڑ احمد کے گال پر پڑا۔ احمد اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے زمین پر گر پڑا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کل سے اگر پیسے پورے نہ ہوئے تو ہاتھ پیر توڑ دوں گا پھر تو زیادہ بھیک ملے گی تجھے۔ شریفو نے بے رحمی سے کہا چل دفع ہو جا۔

یہ لڑکا استاد پورے ساٹھ روپے۔ حمایت نے ریزگاری کی پونلی آگے بڑھائی۔

تو واقعی میرا نام روشن کرے گا اور میری سیٹ سنبھالے گا ایک آدھ دن میں استاد سے بات کروں گا کہ تجھ کو کھانے کو اچھا دے۔ یہ لے دس روپے عیش کر۔ شریفو نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔

احمد کیا پیسوں میں ڈنڈی مارتا ہے۔ شریفو نے حمایت سے پوچھا۔

استاد! دراصل احمد کو بھیک مانگنا اچھا نہیں لگتا اس لئے وہ آواز بھی نہیں لگاتا اور لوگوں کے پیچھے پڑنے سے گریز کرتا ہے جبکہ میں لوگوں کے پیچھے پڑ جاتا ہوں آخر لوگ تنگ آکر بھیک دے ہی دیتے ہیں۔ حمایت نے کہا۔

ابا بھیک نہیں مانگے گا تو کھائے گا کہاں سے بھیک تو ایک آسان روزی ہے۔ شریفو نے کہا۔

استاد وہ محنت مزدوری کرنا چاہتا ہے۔ حمایت نے کہا۔

اچھا محنت، محنت کرے گا اس کو ایک بار پھر میرے پاس بلا۔ شریفو نے کہا۔

کچھ دیر بعد احمد شریفو کے پاس کھڑا تھا۔ ”تو محنت کرے گا۔“

حمایت باقی لڑکوں کو بھی یہیں بلا لے تاکہ وہ اس کو دیکھ کر سبق حاصل کریں کیونکہ یہ محنت کرے گا اس لئے سب سے پہلے میں اس کو کسرت کرادوں پھر باقی لڑکے ایک کو نے میں کھڑے ہو گئے۔ شریفو نے بیدار اٹھا کر احمد پر برسائے لگا۔ اس نے احمد کی اتنی پٹائی کی تھی کہ احمد کا برا حال ہو گیا۔ آج میں استاد دلاور سے بات کروں گا کہ تو قابو سے باہر ہو رہا ہے۔ تیرا کچھ بندوبست کرے۔ شریفو نے احمد کو گھورتے ہوئے کہا۔

حمایت کو اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کیوں احمد کے بارے میں بتایا کیونکہ شریفو استاد دلاور سے بات کرے گا جو پہاڑیوں میں خفیہ مقام پر رہتا ہے اور کبھی کبھی ایک دو لڑکوں کو آنکھوں پر پٹی بندھوا کر بلاتا تھا۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ استاد دلاور احمد کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ کیونکہ استاد بے رحم اور ظالم واقع ہوا تھا اور اب شاید احمد اپنے پیروں پر چل نہ سکے حمایت سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

چھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد طاہر نے اپنی لمبی لمبی بند پلکوں کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا۔ لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں معمولی سی جنبش بھی نہ دے سکا۔ نیم غنودگی کی حالت میں طاہر اپنی ماں کو پکار رہا تھا۔ ”امی! امی“ تھوڑا سا پانی۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ پانی! پانی! لیکن جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

اس نے اپنی سانس گھنٹی ہوئی محسوس کر کے ایک گہری سانس لی۔ جس سے اسے ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ اور اس کی نیند بھری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے زیر لب کہا۔ ”میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے۔“ فوراً اسے خیال آیا کہ جب وہ سکول سے واپس آ رہا تھا تو ایک شخص نے اس سے پتہ معلوم کیا اور جب اس نے پتہ بتا دیا تو اس نے مٹھائی دی اس نے لینے سے انکار کر دیا مگر اس نے بے حد اصرار کر کے اس کو مٹھائی کھلا دی۔ جس کو کھا کر اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور اس کو کچھ معلوم نہیں ہوا کہ کون اس کو یہاں کب لایا ہے۔

امی! امی! پھر اس نے پکارا اور بوجھل آنکھوں سے اپنی ماں کو تلاش کرنے لگا کیونکہ رات کو جب بھی اس کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ اپنی ماں کو سوتا دیکھ کر اطمینان سے آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ طاہر آٹھ سال کا ہونے کے باوجود بڑے بڑے ارادے رکھتا تھا۔ اسے اپنے وطن سے والہانہ پیار تھا اور ان ارادوں کو پختہ کرنے میں ماں کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیئے لیئے اس نے محسوس کیا کہ وہ کمرے میں تنہا ہے جہاں سورج کی کرن کبھی بھولے سے بھی نہ آئی ہو اور جو کافی عرصے سے بند پڑا ہو۔ اس ماحول نے اس کے چھوٹے سے لیکن مضبوط دل میں بھی خوف پیدا کر دیا لیکن فوراً ہی اس کو اپنی ماں کے الفاظ یاد آ گئے۔ ”مسلمان خدا کے سوا کسی دوسری طاقت سے کبھی نہیں ڈرتا۔“

خیال کے آتے ہی اس نے خود سے کہا نہیں! میں بزدل نہیں۔ میں بہادر ہوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے خیالات کو کسی بڑے سے دروازے کی چرچاہٹ نے توڑ دیا۔ وہ بے اختیار آواز کی طرف مڑ گیا۔ وہ حیران و پریشان اسی طرف دیکھتا رہا۔ غالباً دروازہ کھولا جارہا تھا۔ ایک بار پھر ایک انجانے سے خوف نے اس کے بدن میں جھرجھری پیدا کر دی لیکن فوراً سنبھل گیا اور اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے بولا کون ہے؟۔ اس کے جواب میں کمرے میں پہلی سی روشنی پھیل گئی جس نے کمرے کی اداسی کو اور بڑھا دیا۔ روشنی اتنی پھیل چکی تھی کہ ایک سیاہ انسانی سایہ تو نظر آتا تھا لیکن اس کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ یہ شریفو تھا جس کا کام ہی بچوں کو اغوا کرنا تھا۔

طاہر نے پھر سوال کیا آپ کون ہیں؟ شریفو نے کہا خاموش رہو۔ شور مچانا بے سود ہے۔ یہ موٹی موٹی دیواریں پہاڑوں کے پیچھے ہیں۔ طاہر سہم گیا اور شریفو نے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھا لیا وہ نامعلوم تاریک راستوں سے ہوتا ہوا تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ طاہر پوری طرح ہوش میں تھا باوجود کوشش کے وہ کچھ دیکھ نہ پا رہا تھا۔ شاید شریفو رک کر کسی دروازے کو کھول رہا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا اسے ویسے ہی دھیمی روشنی نظر آئی اور ساتھ ہی سیاہ جسم جو خاموش بتوں کی طرح اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے تھے۔ جیسے ہی شریفو طاہر کو لے کر اندر داخل ہوا ایک بار عب آواز مکاری اور عیاری سے بھری ہوئی گونجی۔ بہت معصوم چہرہ ہے اس کا۔ اور اس کی بے نور آنکھیں اس کی مصیبت میں اور اضافہ کر دیں گی۔ زیادہ بھیک ملے گی کیونکہ اپاج پر لوگ رحم کھا کر زیادہ دیتے ہیں۔

ایک اور آواز آئی استاد ہم تیار ہیں آپ حکم دیں۔ نکال دو اس کی آنکھیں۔ یہ استاد کا حکم تھا۔ طاہر چیخ اٹھا۔ چھوڑ دیں مجھے چھوڑ دیں۔ خاموش رہو۔ ایک آواز آئی۔ میری امی مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ وہ اکیلی ہوں گی۔ استاد بولا ”خاموش“ وہ چیخا ”نکال دو اس کی آنکھیں“ یہ سن کر طاہر چیخ اٹھا لیکن اس جگہ پر طاہر کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا ایک دفعہ پھر ہوا کے ساتھ طاہر کی دم توڑتی ہوئی آواز فضاؤں میں گونج گئی۔ امی..... امی..... اور اس کے لرزتے ہوئے ہونٹ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ صبح کا جالا پھیل رہا تھا۔

استاد دلاور کے لئے یہ اجالارات کی تاریکیوں سے بھی زیادہ سیاہ تھا۔ آج ظالم خود اپنے ہاتھوں مظلوم بن گیا تھا۔ اس نے سینکڑوں ماؤں کی گودیں اجاڑی تھیں۔ سینکڑوں باپ بے سہارا کر دیئے تھے اس نے نہ معلوم کتنے بے گناہ نونمالوں کو اندھا، لنگڑا اور اپاج کر کے سرعام بھیک مانگنے کے لئے بیٹھا دیا تھا۔ لیکن کبھی اس پتھر دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔

لیکن آج اس کا دل آنسو بن کر آنکھوں کے راستے بہہ رہا تھا۔ آج وہ خود بے سہارا اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان طاہر کی لاش کے پاس بت بنا کھڑا تھا۔ طاہر کے جسم پر پڑا نشان پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

”طاہر تمہارا بیٹا ہے“ اس کے بازو پر بندھا ہوا آبائی تعویذ جیج رہا تھا۔ طاہر تمہارا بیٹا ہے۔ آج سے پورے سات سال پہلے اس نے اپنی انہی بری عادتوں کی وجہ سے اپنے پیارے بیٹے اور معصوم بیوی کو خیر یاد کہہ دیا تھا اور پھر لوٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔ آج وہ اس ملن کی گھڑی پر حیران تھا کہ قدرت نے ان کا ملاپ کس طرح کرایا۔

.....

شاہد

ڈاکٹر گڈا

کامران اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس کے والد ایک محنتی کلرک تھے۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے کامران ماں باپ کی آنکھ کا تار اور دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا۔ اس کی ہر خواہش ماں باپ پوری کرتے تھے۔

کامران کی امی ایک معمولی پڑھی لکھی لیکن سکھڑ خاتون تھیں۔ وہ کامران کی ذہنی تربیت اور اخلاق کا بھی خیال رکھتی تھیں۔ اور اس کو وہ ہر روز اچھی اچھی کہانیاں اور بزرگوں کے اقوال سناتیں کیونکہ کامران کو ابھی پڑھنا نہیں آتا تھا وہ ابھی پہلی کلاس میں داخل ہوا تھا لیکن تمام اچھی باتیں اس کو ذہن نشین تھیں۔

جب وہ اپنے ننھے منے دوستوں میں کھیل رہا ہوتا اور کوئی جھوٹ بولتا تو وہ فوراً کہتا۔ ”جھوٹ بولنے والے سے اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں“ کوئی دوست کسی کی چغلی کر رہا ہوتا تو وہ کہتا کہ۔ اللہ میاں چغلی اور غیبت کرنے والے سے سخت ناراض ہوتے ہیں جو کوئی کسی کی چغلی کرتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اگر کوئی لڑ رہا ہوتا تو وہ کہتا تھا میں برکت ہے، ہمیں آپس میں محبت اور دوستی سے رہنا چاہئے اور ایک دوسرے کے کام آنا چاہئے۔

کامران کی امی اس کو ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا، بیماروں کا علاج کرے گا اور جب غریبوں کا مفت علاج کرے گا تو لوگ خوش ہو کر اس کو دعائیں دیں گے۔ اپنی امی کی یہ باتیں سن کر کامران اپنے آپ کو تصور ہی تصور میں بالکل ڈاکٹر دیکھنے لگتا۔ اس کی امی نے اس کو پلاسٹک کا ایک گڈا خرید کر دیا ہوا تھا جس کے کانوں میں اسٹیٹھو اسکوپ بھی لگا ہوا تھا کامران اپنے اس گڈے کو ہر وقت اپنی میز پر رکھتا اور روزانہ اس سے باتیں کرتا کہ میں بھی بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔ تو پلاسٹک کا ڈاکٹر ہے کچھ بھی نہیں کرتا لیکن میں تو لوگوں کا علاج کروں گا اور وہ اللہ کے حکم سے صحت یاب ہو جایا کریں گے۔

بچو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے جو اس کے مقرر کئے ہوئے امتحان میں صبر و تحمل اور مشکلات سے بہتر طریقے سے گزر جائیں گے وہ ہی کامیاب انسان ہوں گے۔ ایسا ہی کامران کے ساتھ ہوا کامران کی والدہ

کچھ دن بیمار رہ کر انتقال کر گئیں اور اس کے سال بھر بعد کامران کے والد نے دوسری شادی کر لی اس وقت کامران کی عمر پوری نو سال بھی نہیں ہوئی تھی۔

نئی ماں نے شروع شروع تو کامران سے اچھا برتاؤ کیا لیکن پھر ان کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ جب کامران کا دوسرا بھائی سلمان آیا۔ تب تو سوتیلی ماں نے اس سے نوکریوں کی طرح کام لینا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا شروع کر دی وہ اس سے جھاڑو دلواتی کپڑے برتن تک دھلواتی اور اس طرح اس کو پڑھنے تک کا وقت نہ ملتا اور سکول بھی بہت کم جاتا۔ کامران کی سگی ماں نے اس کی پرورش چونکہ دینی اصولوں پر کی تھی اس لئے وہ صبر و تحمل سے سب کچھ برداشت کرتا رہتا۔ اور رات کو وہ اپنے ڈاکٹر گڈے سے اپنے اوپر دن بھر کی گئی زیادتوں کی باتیں کرتا وہ اپنا دکھ درد گڈے کو سنا کر پرسکون ہو جاتا جیسے کہ وہ ڈاکٹر ہو اور اس نے اس کو صحت یاب کر دیا ہو اور وہ اس طرح لیٹ کر سو جاتا جیسے اس کو دوا مل گئی ہو۔

کامران کے والد نے دوسری شادی لوگوں کے کہنے پر کامران کی وجہ سے کی تھی اب وہ سمجھتے تھے کہ نئی بیگم نے گھر کا ہر کام اچھی طرح سنبھال لیا ہے۔ وہ گھر کی کسی بات میں دخل نہیں دیتے تھے اور کامران نے بھی کبھی اپنے ابو سے نئی ماں کی زیادتوں کا ذکر نہیں کیا۔

جب کامران کا تیسری کلاس کا رزلٹ نکلا تو وہ فیل ہو چکا تھا اس کی رپورٹ جب اس کے ابو نے دیکھی تو بہت غصہ ہوئے نئی ماں جو کہ قریب ہی بیٹھی تھیں بولیں یہ تو ہر وقت اپنے کمرے میں گڈے سے کھیلتا رہتا ہے یہ کیا پڑھے گا۔

کامران اپنی ماں کی یہ بات سن کر سہم گیا۔ اسے اپنے ڈاکٹر بننے کا خواب ٹوٹا نظر آیا اس نے کہا نہیں ابو میں پڑھوں گا اس کے ابو بولے ٹھیک ہے اگر اب میں نے ایسی رپورٹ دیکھی تو اچھا نہ ہو گا۔ ٹھیک ہے ابو وعدہ۔ کامران روتا ہوا اپنے کمرے میں گیا اس کی نظر گڈے پر پڑی تو اس نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا اور بولا امی آپ نے یہ گڈا مجھے لے کر دیا تھا میں ضرور اس جیسا بنوں گا یہ میری ساری باتیں سن کر مجھے مطمئن کرتا ہے یہ بھی واقعی بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔

اگلی صبح جب کامران سو کر اٹھا تو اس نے سکول جانے کی تیاری کی تو گڈا بھی بستے میں رکھ لیا تاکہ وہ اپنے ڈاکٹر بننے کے خواب سے غافل نہ ہو جائے اب وہ ہر وقت ڈاکٹر گڈا اپنے پاس رکھتا تھا۔

ایک دن وہ سکول سے تھکا ہوا آیا تو باورچی خانے میں پانی پینے کے لئے گیا وہاں اس کی امی کھانا پکا رہی تھیں۔ اور پاس ہی ننھا سلمان کھڑا تھا۔ کامران ابھی تک بستہ ڈالے ہوئے تھا جس میں گڈا بھی تھا۔ سلمان کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی اس نے اس کے بستے میں ہاتھ ڈال کر وہ گڈا کھینچ لیا کامران نے جھپٹ کر گڈا اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جس پر ننھا سلمان چیخ کر رونے لگا۔ سلمان کو روتا دیکھ کر اس کی امی غصے میں آ گئیں۔ انہوں نے کامران سے چیخ کر کہا گڈا فوراً سلمان کو دے دو۔ یہ سن کر کامران گڈا لے کر بھاگنے لگا تو اس کی سوتیلی ماں نے جھپٹ کر اسے پیچھے کالر سے پکڑا اور گڈا چھین کر کہا لے ابھی اس کا کام تمام کرتی ہوں اور اس کو مٹی کے

تیل کے جلتے ہوئے چولہے پر رکھ دیا اور کامران کو دھکا دے کر باورچی خانے سے نکال دیا ابھی وہ چولہے کی طرف پلٹی ہی تھی کہ زور کا دھماکا ہوا اور آگ نے باورچی خانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چیخ و پکار پر جب کامران واپس باورچی خانے کی طرف بھاگا تو دیکھا اس کی سوتیلی ماں سلمان کو اٹھا کر باہر آرہی ہیں اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور باورچی خانے میں بھی شعلے بلند ہو رہے ہیں۔

چیخ و پکار کی آواز پر محلے والے جمع ہو گئے۔ پھر محلے والوں نے فائر بریگیڈ کو فون کیا اور کامران کی سوتیلی ماں اور بھائی کو ابتدائی طبی امداد کے بعد ہسپتال پہنچا دیا جہاں سلمان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے کچھ ہی دیر بعد انتقال کر گیا۔

کامران کے ابو کو آگ لگنے کی اطلاع آفس میں فون پر دی گئی وہ فوراً وہاں سے ہسپتال کے لئے روانہ ہوئے ہسپتال پہنچ کر انہیں سلمان کی موت اور بیگم کی آنکھیں ضائع ہونے کی اطلاع ملی۔ یہ دل کے مریض تو پہلے سے تھے اس اچانک اور شدید غم سے ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی انتقال کر گئے۔ اب کامران کو ہی اپنے آپ کو اور اپنی سوتیلی نابینا ماں کو سنبھالنا تھا۔ وہی ماں جو اس سے برا سلوک کرتی یہ جانتے ہوئے بھی کامران نے اپنے دل ہی میں اپنی سوتیلی ماں کو معاف کر دیا۔ کیونکہ ہمیشہ اسے ایسے حالات میں اپنی سگی ماں کا وہ چہرہ، وہ باتیں اور وہ نصیحتیں یاد آ جاتی تھیں جو وہ اس کو بچپن میں بتا گئی تھیں۔

کامران نے اپنی ماں کی بیمار داری کی اور اس کے علاج کے لئے محنت مزدوری کرنی شروع کر دی شروع میں تو اس نے اینٹیں بنانے کے بھٹے میں مزدوری کرنی شروع کی وہ وہاں دوڑ دوڑ کر گھلا ہوا مصالحہ ٹوکری میں لا کر دیا کرتا اور اس طرح اسے فی سینکڑہ کے حساب سے پیسے ملتے وہ بازار سے روٹی سالن اور پھل لے کر سوتیلی ماں کے پاس جاتا جس کو سگے بیٹے اور شوہر کی موت نے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ ندامت اور شرم سے اس سے بات کرتے ہوئے بھی کتراتے تھیں۔ ان کا ضمیر ان کو بار بار ملامت کرتا رہتا تھا کہ آخر تو کیوں غصے سے بے قابو ہوئی تو نے اسے آنکھیں نکالنے کی دھمکی دی تھی لیکن قدرت نے خود تجھے ہی اندھا کر دیا۔

کامران کو اپنے باپ کے مرنے کا غم تو تھا لیکن اس نے صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے شاید میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہو۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے کبھی کوئی شکوہ نہ کیا۔

اب وہ اپنی سوتیلی ماں کو ہسپتال سے گھر لے آیا اور کہا کہ امی مجھے معاف کر دیں میری وجہ سے سلمان بھائی اور ابو کا انتقال ہوا اور آپ کی بینائی ضائع ہوئی میں جب ڈاکٹر بنوں گا تو آپ کی آنکھوں کا علاج کروں گا۔ سوتیلی ماں یہ سن کر بے حد شرمندہ ہوئیں اور کامران کو سینے سے لگا کر بولیں۔ بیٹا تو بہت عظیم ہے میں بے حد شرمندہ ہوں، مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ہی اپنے سلمان اور تیرے ابا کی دشمن ہوں۔ مجھے تو معاف کر دے کامران نے کہا۔ ماں جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوا اب میں آپ کی خدمت کروں گا۔ آپ انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

اب کامران صبح اٹھتا، اپنے سکول جاتا، چھٹی ہوتی تو وہ گھر آتا، کھانا کھاتا جو اس نے صبح سویرے ہی اٹھ کر اپنی ماں کی مدد سے پکایا ہوتا تھا۔ پھر اینٹوں کے بھٹے پر جا کر مزدوری کرتا جس سے وہ تھک جاتا اور گھر آکر ان مزدوری کے پیسوں سے سودا سلف لاکر اگلے دن کے لئے رکھتا اور پھر سکول کا کام کرتا۔ اس طرح رات کو وہ صرف دو تین گھنٹے آرام کرتا۔ وقت گزرتا گیا وہ ہر امتحان میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا اور اب اس نے اینٹوں کے بھٹے کی مزدوری چھوڑ کر دوکان پر سیلز مین کا کام کیا، پھر ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی وہ اپنے مقصد کے حصول میں لگا رہا۔ ٹیوشن سے اس کے گھر کا خرچ باسانی چلنے لگا اور اس طرح اس کا کتاب کاپی اور فیس کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا تھا۔ اب اس کی ماں بھی کچھ پرسکون سی ہو گئی تھیں اور جب وہ رات کو ٹیوشن پڑھا کر گھر آتا تو وہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہوتی تھیں، وہ اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتیں اور دعائیں دیتیں۔

کامران نے انٹر سائنس کا امتحان بھی بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور اسے آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا اور وہ دن رات محنت کرتے کرتے آخر ایک دن آنکھوں کا سرجن بن گیا اب وہ اپنی سگی ماں سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کر چکا تھا، وہ ڈاکٹر بن گیا تھا۔ اس نے سوچا آج میری ماں کی روح کتنی خوش ہوگی لیکن اسے ابھی ایک وعدہ اور پورا کرنا باقی تھا جو اس نے اپنی سوتیلی ماں سے کیا تھا کہ وہ ان کی آنکھوں کا علاج کرائے گا۔ کامران اب اپنی ماں کا علاج با آسانی کر سکتا تھا کیونکہ اب اس کا اپنا چھوٹا سا کلینک تھا۔ پیسوں کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا اس نے اپنی ماں کا چیک اپ کرایا اور اس کو علاج کے لئے بیرون ملک لے گیا جہاں اس کی سوتیلی ماں کی بینائی بحال ہو گئی۔ جب پٹی کھلی تو اس نے سب سے پہلے کامران کا ہی معصوم، پر نور چہرہ دیکھا۔ وہ عزم و استقلال کا پیکر بنا مسکرا رہا تھا وہ واقعی ویسا ہی گڈانظر آ رہا تھا جیسا پلاسٹک کا گڈاؤ اکثر تھا۔

بچوں کا ادب

بچوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور ان میں اچھے مسلمان اور سچے پاکستانی ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لیے، دعوتِ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی جانب سے مختلف عمر کے بچوں کے چار گروپوں پہلی سے تیسری جماعت، چوتھی، پانچویں جماعت، چھٹی سے آٹھویں جماعت اور نویں دسویں جماعت کے لیے دلچسپ اور با مقصد کتب کا مطالعہ کیجئے۔

آغازِ سفر

تین دوست

رسولِ پاک

کایا پلٹ

شہین اور فاختہ

بطخ کا بچہ

سنگین وجہ

آزادی کا دن

ریچھ اور گلہری

خدا پر بھروسہ

اُونچے درختوں کا باغ

ماسٹر جی

حرکت میں برکت

تمہارا یہ آنسو

کالا چور

Price Rs. 7/-

شعبہ مطبوعات

دعوتِ اکیڈمی، دسویں بلک، اسلام آباد